سات سال کا وہ کمسن بچہ ڈرا سہما ہوا ٹرین کے ایک بدبودار ڈبے میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کچھ بھی ہو جائے مرتجز یہاں سے کہیں مت جانا جب تک کوئی تمہیں بچانے نہ آئے۔" اسکا بوڑھا باپ جسکی ایک بازو خون آلودہ تھی اور آنکھیں خوفزدہ تھیں وہ اپنے پانچ سالہ مرتجز علی زامان کو اس سب سے بچانا چاہتا تھا۔

"اور سنو اگر وہ لوگ یہاں آجائیں تو بھاگنے کی کوشش کرنا۔" اس نے معصوم بچے کو کندھوں سے تھام کر کہا۔

"تم سمجھ رہے ہو ناں میرے بچے؟" وہ روتے ہوئے اسکے معصوم ہاتھ چومتے ہوئے بولا۔ معصوم مرتجز نے ہاں میں سر ہلایا۔ اسے بس وہیں بیٹھے رہنے تھا اور اپنے باپ کا انتظار کرنا تھا مگر وہ بوڑھا لاچار روتا ہوا باپ جانتا تھا وہ نہیں لوٹ سکے گا۔ وہ زار و قطار اپنے بچے کو چومتے ہوئے رو رہا تھا۔ بلآخر وہ اسے ایک سیٹ کے نیچے چھپا کر وہاں سے چلا گیا۔

اسے ڈر لگ رہا تھا، اسے خوف آرہا تھا۔ وہ بار بار اپنے ننھے ہاتھوں سے آنسوں صاف کرتا۔ ٹرین کے ڈبے میں پھیلی بدبو میں سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ بدبو اندر سے کم اور باہر سے زیادہ آرہی تھی۔ خون کی بو۔۔۔ ہر جانب تازہ انسانی

خون پھیلا ہوا تھا۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھے باہر سے آنے والی خوفناک آوازوں کا گلا گھونٹنا چاہتا تھا۔ لوگ چیخ رہے تھے، اپنی جان بچانے کو بھاگ رہے تھے مگر بے سود۔ نارنجی پگڑیوں والے وہ لوگ ہر مسلمان کو الگ وطن جانے سے پہلے یہی مار دینا چاہتے تھے۔ یہ بٹوارے کا وقت تھا۔ وقت تھا پاکستان بننے کا۔ وقت تھا مسلمانوں کو انکا حق ملنے کا مگر ہندو ایسا کبھی نہیں چاہتے تھے۔

ہاں ہم نے ملک کو بنتے دیکھا ہے۔۔

ہم نے جسم کا جلنا، اپنوں کا مرنا دیکھا ہے۔۔۔

میراث کا چھیننا، لہو کا بہنا دیکھا ہے۔۔۔

تخت الٹتے دیکھا ہے، پھر وقت پلٹتے دیکھا ہے۔۔۔

ہاں ہم نے ملک کو بنتے دیکھا ہے۔۔۔

لمحہ وہ کہ جب لہو کی بوند بوند گری تھی۔۔۔

ہاں ہم نے وہ وقت گزرتے دیکھا ہے۔۔۔

زندہ جسموں کو بن روح ہوتے دیکھا ہے۔۔۔

ہاں ہم نے ملک کو بنتے دیکھا ہے۔۔۔

اچانک ایک مخصوص آواز کے ساتھ ٹرین سٹارٹ ہوئی۔ بچے نے ڈر کر

کھڑکی سے باہر جھانکا۔اسکا باپ؟؟کہاں تھاوہ؟؟وہ روتے ہوئے باہر دیکھ رہا تھاجب اسنے کچھ سنا۔وہ معصوم بچہ بھی ان قدموں کی چاپ میں چھپی درندگی محسوس کر چکا تھا۔وہ ڈر کر کھڑکی کے ساتھ نیچے بیٹھ گیا۔سامنے تین ہٹے کٹے مرد ہاتھوں میں تیز دھار تلواریں اٹھائے کھڑے تھے۔

"اٹھالیتے ہیں اسکو۔اسکو تو یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ مسلمان ہے یا نہیں۔" ایک لڑکے نے مشورہ دیا۔

"خون تو انہیں بدزات مسلمانوں کا ہے ناں۔مار سالے کو۔"دوسرے لڑکے نے کہا۔

چند لمحوں کا کھیل تھااور ٹرین کے اس حصے میں اتنی خوفناک چیخ گونجی کہ ہر روح دھل جائے۔وہاں موجود ہر چیز نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔چند لمحوں کا کھیل اور مکمل خاموشی۔ایک ایسی خاموشی جو انسان کے بولنے کی سکت چھین لے۔

خون کی بدبو میں اضافہ ہو چکا تھا۔خون ٹرین کے چلنے کی وجہ سے ہر کونے میں پھیل چکا تھا۔

***

اسکی آنکھ کسی مخصوص شے کے ٹکرانے پر کھلی تھی۔چند لمحے اسکی آنکھوں

کے آگے اندھیرا چھایا رہا۔

"اٹھ جاؤ بچے۔" کسی کی آواز اسکے کانوں میں پڑی۔

"ابو جی۔" یہ وہ پہلا لفظ تھا جو اس نے آنکھ کھلنے پر بولا۔ مگر سامنے موجود لڑکی کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"بھوک لگی ہے؟" اس پچیس چھبیس سالہ لڑکی نے مسکرا کر پوچھا۔ مرتجز نے اپنی معصوم نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ مٹی کا کچا مکان جس میں مٹی کی مدد سے کچے سلیب بنائے گئے تھے۔ ہر چیز مٹی کی بنی تھی سادہ مگر خوبصورت۔

"اٹھ گیا یہ؟" ایک لڑکا لکڑی کے سبز رنگ کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"جی مرزا صاحب ابھی ہی اٹھا ہے۔" وہ لڑکی اپنا دوبٹہ درست کرتے ہوئے بولی۔

"قدسیہ تم زیب النساء کو دیکھو جا کر میں دیکھتا ہوں اسے۔" وہ شخص جسکا نام مرزا خلیل تھا اسکے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

مرتجز ہر چیز کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"نام کیا ہے تمہارا بچے؟" وہ شخص نرمی سے بولا۔ مرتجز خاموشی سے اسے

دیکھتا رہا۔

"ڈرو مت۔۔" مرزا نے اسکے بازو پر تھپکی دینا چاہی مگر وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔

"اچھا اچھا نہیں لگاتا ہاتھ۔" اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے۔

"باپ کا نام کیا ہے؟" اس نے ایک اور سوال پوچھا۔

"ابو۔" مرتجز کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔

"ابو۔۔۔ ابو۔۔ کدھر ہیں؟" اس نے نظریں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"تم نام بتاؤ کے تو ڈھنڈیں گے ناں۔" اس نے ایک بار پھر نرمی سے کہا۔

"مجھے نہیں یاد۔" اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"اچھا اپنا نام تو بتاؤ۔" بلآخر وہ اس سے کچھ کہلوانے میں کامیاب ہوا تھا۔

"میرا نام۔۔۔۔ مرتجز علی زمان۔" اس نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو شاباش کھانا کھالو پھر بات کرتے ہیں۔" مرزا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

مرتجز خاموشی سے اسکے پیچھے چل پڑا۔ وہ ہر ہر چیز کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ گھر بہت بڑا نہ تھا مگر انتہائی خوبصورت تھا۔ ایک ہی قطار میں تین کمرے تھے جنکے سامنے کشادہ صحن تھا۔

کمروں کے بائیں جانب چھوٹا سا باورچیخانہ تھا۔ محض تین جانب چھوٹی سی دیوار تھی جس کے اوپر بڑے بڑے پتوں کی مدد سے دھوپ کو زمین پر پہنچنے

سے روکا گیا تھا۔ گھر کے سامنے کشادہ سرسبز کھیت تھے۔ کھیتوں کے سامنے دور کچھ اور کچے مکان تھے۔ قدسیہ تندور سے تازہ روٹیاں اتار کر لائی۔ اسنے کمر پر ایک جانب ایک پانچ سالہ بچی کو اٹھا رکھا تھا۔ اس بچی کی آنکھیں رو رو کر سوج چکیں تھیں اور آنسوں اسکے گالوں پر جم چکے تھے۔ مرتجز نے بہت غور سے اسے دیکھا۔

"کیسی ہے زیبی؟" مرزا نے بچی کو گود میں لیتے ہوئے پوچھا تو وہ بچی بلا تاخیر کیے ایک بار پھر رونے لگی۔

"جب سے حادثہ ہوا ہے تب سے روئے جا رہی ہے خاموش ہی نہیں ہوتی۔" قدسیہ بیگم نے کہا۔ وہ سب انکی تلقید میں ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے میں ایک جانب دو چارپائیاں بڑیں تھیں اور باقی دو جانب لکڑی کی کرسیاں رکھی تھیں۔ درمیان میں ایک چٹائی رکھی تھی۔ وہ سب اس پر بیٹھ گئے۔

"لسّی اچھی لگتی ہے؟" قدسیہ نے مٹی سے بنے کٹورے میں لسی اسکے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے محض سر ہلا دیا۔ مٹی کی ایک پلیٹ جسی طشتری کہا جاتا ہے اس میں تازہ پودینے کی چٹنی جسکی مہک نتھوں سے ٹکراتے ہی کھانے کو جی چاہے اور ساتھ تندور کی تازہ روٹی اور لسّی اسکے سامنے رکھی گئی۔ گرمی

کی شدت کی وجہ سے وہ لوگ اس موسم میں زیادہ سے زیادہ لسّی کا استعمال ہی کرتے تھے۔ وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا جبکہ زیب النسا اس اضافی فرد کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ روٹی کیوں نہیں کھا رہی؟" اس نے زیب النساء کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جسے اسکا باپ نا جانے کب سے کھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسکی بات پر دونوں میاں بیوی مسکرا دیے۔

"کھالے ابھی میری پیاری سی گڈی ہیں ناں؟" مرزا نے مسکرا کر نوالہ اسکے منہ کے سامنے کیا مگر اس نے باپ کے سینے سے سر لگا لیا۔ نظریں ہنوز اس اضافی فرد پر جمی تھیں۔

"کھالو زیب النسا ورنہ جن آجائے گا۔" وہ اپنی معصوم سی زبان میں بولا جسے سن کر ان دونوں میاں بیوی کا قہقہا گونجا تھا۔ وہ انکی سوچ سے بھی جلدی ان سے گھل مل گیا تھا۔ مگر انکی ہنسی تب تھمی جب زیب النساء اسکی بات سنتے ہی باپ کی گود سے نکل کر خاموشی سے چٹائی پر بیٹھی اور اپنے ننھے ہاتھوں سے نوالہ بنا کر کھانا کھانے لگی۔ مرتجز نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

ان میاں بیوی کو اس بچے سے خوف آیا۔ وہ اتنا سب اپنی نظروں سے دیکھ کر اتنا پر سکون کیسے تھا؟ کوئی عام بچہ ہوتا تو زیب النساء کی طرح اتنا خون خرابا دیکھ

کر ہفتہ پورا رونا دھونا مچائے رکھتا۔

***

مرزا خلیل خوش قسمتی سے ہندوستان کے اس حصے میں بستے تھے جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ انہیں مرتجز کی طرح اپنا سب کچھ گنوانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ مگر اس بٹوارے کے دوران انہیں ایک صبح وہ معصوم اپنے صحن میں پڑے ملا۔ اسکا لباس مکمل خون آلودہ تھا۔ قدسیہ کا تو کلیجہ حلق میں آنے کو تھا۔

شاید اسکے ماں باپ جان بچانے کو تھے اور اسے یہیں چھوڑ گئے ہوں۔ ان نے بغیر کسی فائدے کے تین دن اس معصوم کا خیال رکھا۔ تین دن بعد وہ ہوش میں آیا تھا۔ ابھی اس سے ایسا کچھ پوچھنا انتہائی غلط ہوتا۔ مگر چند دن گزرنے کے بعد مرزا خلیل کو محسوس ہوا اس بچے میں کچھ خاص تھا۔ وہ عام نہیں تھا۔

"بچے تمہیں کچھ یاد ہے تم یہاں کیسے آئے؟" ایک رات صحن میں لیٹے مرزا نے اس سے پوچھا۔ گرمیوں کا موسم تھا جسکی وجہ سے وہ لوگ کھلے آسمان تلے اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ قدسیہ کے ہاتھ میں ایک انتہائی خوبصورت ہاتھ سے بُنی پنکھی تھی جس سے وہ خود کو اور زیب النساء کو ہوا کر رہی تھی۔ ایسا ہی مرزا اور مرتجز کا بھی حال تھا۔

"ہاں۔"اس نے بلا تعمل کہا۔

"اچھا بتا کیسے ؟"

"ابو مجھے ایک ٹرین میں چھوڑ کر گئے تھے۔"اس نے بولنا شروع کیا۔

"ٹرین میں کیوں ؟"مرزا نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ ان سب کو مار رہے تھے ابو نے مجھے چھپنے کے لیے کہا اور کہا یہ ٹرین پاکستان جائے گی اگر وہ نہ آئے تو میں خاموشی سے بیٹھا رہوں۔"اس نے کسی عقل مند کی طرح جواب دیا۔

"اچھا پھر ؟"مرزا نے پوچھا۔قریب پڑی چارپائی پر موجود قدسیہ اور زیب النساء بھی سب سن رہی تھیں۔

"پھر وہ لوگ ٹرین۔۔۔۔۔"وہ کچھ کہتے کہتے کر گیا۔

"ہاں کیا ہوا پھر ؟"مرزا نے پوچھا۔

مگر مرتجز زار و قطار رونے لگا۔

"وہاں خون تھا بہت خون۔"وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔

"پھر ؟"وہ اسے تھپکتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔وہ اسے یہ نہیں کہنا چاہتے تھے کہ خاموش ہو جاؤ۔وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ انکے گھر تک کیسے آیا۔

"مجھے۔۔۔مجھے۔۔ نہیں یاد۔۔۔" وہ یہ کہتے ہوئے اچانک سے بلکل خاموش ہو گیا۔ مرزا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اور ایک زوردار چیخ گونجی۔

"مرتجز۔۔ مرتجز۔۔۔ کیا ہوا بچے؟" وہ بے حوش پڑے مرتجز کو ہلاتے ہوئے بولے۔

قدسیہ اور زیب النساء بھی اٹھ بیٹھیں۔

"قدسیہ۔۔ قدسیہ جاؤ پانی لے کر آؤ۔" انہوں نے کہا تو قدسیہ دوڑ کر جا کر مٹکے سے پانی بھر کر لائی۔ پانی کی بوندیں چہرے پر پڑتے ہی مرتجز نے آنکھیں کھولی۔

"پانی پیو۔" مرزا نے اسکی گردن اونچی کر کے پانی اسکے لبوں سے لگایا۔ پانی پی کر وہ ایک مرتبہ پھر سے پر سکون ہو گیا۔

وہ کوئی عام حادثہ نہ تھا، زیب النساء محض مرتجز کو خون آلودہ حالت میں دیکھ کر اتنی ڈری کہ اگلے چند دن رونے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ سوا انکے خیال مس مرتجز پر اس سب کا گہرا اثر پڑا تھا اس لیے وہ اس سے اس بارے میں بلکل بات نہیں کرتے تھے۔

***

"میرے ابو بہت مزے کا گوشت پکاتے تھے۔" ایک دو پہر کھانا کھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"اچھا تمہیں یاد ہے؟؟" قدسیہ نے پوچھا۔ اتنا انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اس حادثے میں اسکا باپ مر چکا تھا اس لیے وہ نہیں لوٹا تھا۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔" اس نے دانتوں سے گوشت کے ٹکڑے کو کھینچتے ہوئے کہا۔

"اور تمہاری امی، کیا اچھا بناتی تھی؟" قدسیہ نے دل بڑا کر کے اس سے پوچھا۔

"امی؟؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں تمہاری امی کیا بناتی تھی؟" قدسیہ نے پوچھا۔

"میری تو امی نہیں تھی۔" اس نے کہا تو قدسیہ اور مرزا کے ہاتھ تھم گئے۔

"ابو کہتے تھے وہ اللہ میاں کے پاس ہیں۔" اس نے معصومیت سے مسکرا کر کہا۔ ان کو اسکی کہانی تب جا کر سمجھ آئی۔

اسکی ماں بہت پہلے ہی مر چکی تھی اور پھر اس حادثے میں اسکا باپ بھی مر گیا۔ شاید وہ کسی اور کو بے حوش ملا ہو اور وہ اسے مرزا کے در پر چھوڑ گئے۔

مرتجز کے خیال میں اسکی اور زیب النساء کی بہت اچھی دوستی تھی مگر زیب النساء اس سے کوئی بات نہ کرتی تھی۔ مرتجز بہت باتونی تھا وہ ہر وقت کچھ نہ

کچھ بولتا رہتا تھا مگر زیب النساء بس خاموشی سے اسے سنتی رہتی تھی۔ہاں وہ مرتجز کی کوئی بات نہیں ٹالتی تھی۔

***

اسے گاؤں کے ہی ایک سکول میں پڑھنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔گاؤں کی آبادی وقتاً فوقتاً بڑھتی جا رہی تھی۔لوگ وہاں رہنا شروع ہو رہے تھے۔
مرتجز نے دس سال کی عمر تک جو چیز وہاں سیکھی تھی وہ اتحاد تھا۔
روز شام کے وقت گاؤں کی لڑکیاں مل انکے صحن میں جمع ہوتی۔ہاں کرتی تو وہ غیبتیں ہی تھیں مگر اس ماحول میں گونجتے انکے قہقہے اس کچے مکان کو مظبوط کرتے تھے۔اکثر اوقات وہ عورتیں کسی ایک تندور کے گرد ہی جمع ہو کر روٹیاں بناتیں۔
کچھ اچھا کھانے کو نہیں بنا، جاؤ ساتھ والے گھر سے سالن لے آؤ، آٹا ختم ہو گیا ، کوئی بات نہیں یہ پڑوس والی نازنین سے لے آؤ جا کر۔
وہ خالص دور تھا۔ محبتوں اور عزتوں کا۔ان کچے مکانوں میں انسانیت بستی تھی ، محبت اور عزت بستی تھی۔
روز شام کے وقت انکے صحن میں قاری صاحب بچوں کو قرآن پڑھاتے دکھائی دیتے تھے۔ چھوٹے، بڑے، دودھ پیتے ہر قسم کے بچوں کی بولیاں

انکے صحن میں گونجتی تھی۔
مرتجز انکی سوچ سے زیادہ انکے ساتھ گھل مل گیا تھا۔اس نے نہ آج تک محسوس کیا اور نہ ہونے دیا کہ وہ انکا سگا بیٹا نہیں تھا۔وہ بلکل انکے اپنے بچوں کی طرح ان سے زد بھی کرتا اور پیار کی بٹورتا۔

***

"کیا ہوا زیبی۔" وہ شام کے وقت درخت کی چھاؤں تلے بیٹھے سکول کا کام کر رہے تھے جب مرتجز نے زیب النساء کو بلکل خاموش دیکھ کر پوچھا۔انکے ہاتھوں میں لکڑی کی قلم تھی جسے وہ سیاہی میں ڈبو کر تختی پر لکھتے۔
وہ دونوں پڑھائی میں بہت لائق تھے۔
"کچھ بھی نہیں۔" وہ اپنے چہرے کے گرد لپٹا دوبٹہ درست کرتے ہوئے بولی۔
مرتجز ایسے ہی چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔
"مجھے پڑھنا ہے۔" بلآخر اسکی نظروں سے تنگ آکر وہ بولی۔
"تو پڑھو میں کونسا منع کر رہا ہوں؟" مرتجز نے مسکرا کر کہا۔زیب النساء نے جھکی ہوئی گردن مزید جھکا دی۔

"وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے تم پڑھنا چاہو اگر۔" مرتجز نے عام سے انداز میں کہا مگر زیب النساء کو آج بھی اس سے ہمیشہ کی طرح خوف آیا۔

"امی کہہ رہیں تھیں بس پانچ جماعتیں بہت ہیں۔" اس نے اپنے پھولے ہوئے گالوں سے آنسوں صاف کیے۔ ہاتھ ہلانے پر اسکی کلائیوں میں لگی چوڑیوں کی آواز آتی۔

"میں یہ پڑھنے کو تو نہیں کہہ رہا۔" مرتجز اسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

زیب النساء نے حیرت سے اسے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔

"تم قرآن پڑھ لو۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"دیکھو قاری صاحب اب بھی پڑھتے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔۔ہاں تفسیر تم وہ پڑھ لو۔" اس نے معصومیت سے کہا اور زیب النساء کے چہرے کا رنگ اسکی بات سن کر نکھر گیا۔

اسے یاد تھا ایک دن قاری صاحب نے انہیں بتایا تھا

"میں بھی بہت نالائق تھا بچپن میں بس چار جماعتیں ہی پڑھی ہیں میں نے۔ اس کے بعد قرآن حفظ کیا اسکی تفسیر پڑھی۔" وہ کسی بچے کو بتا رہے تھے۔

"آپ نے قرآن کیسے حفظ کیا قاری صاحب؟" ایک بچے نے پوچھا۔

"میرے استاد مجھے ہر ہر لفظ اچھے سے سمجھاتے تھے پھر میں روز اسے یاد کر کے استاد کو سناتا تھا۔" زیب النساء کو جو بات محض سمجھ آئی تھی وہ یہ کہ یہ بھی تو پڑھائی ہے۔ ہاں وہ پڑھے گی قرآن کو۔

***

زیب النساء نے اگلے تین سال میں قرآن حفظ کیا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ اسے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی عام پڑھائی نہیں کر رہی تھی۔ وہ اپنے رب کی نظر میں خود کو لا رہی تھی۔ جیسے بچے سبق یاد کرتے ہیں اور استاد انہیں شاباش دیتا ہے تو بچے خوش ہو جاتے ہیں۔ ویسے ہی زیب النساء نے قرآن حفظ کیا تھا اور اسے امید تھی اسکا رب اس پر اسے شاباش ضرور دے رہا ہو گا۔

***

وہ اب سولہ سال کی تھی مگر اب بھی مرتجز سے بہت کم بات کرتی تھی۔ مگر ہنوز۔۔ اسکی کسی بات سے انکار نہیں کرتی تھی۔

"امی یہ مرتجز کہاں سے آیا تھا ہمارے گھر؟" ایک دوپہر وہ قدسیہ کے ساتھ روٹیاں بنانے میں مصروف تھی جب اس نے پوچھا۔ اسکی رنگت گندمی سی تھی۔ بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھیں اور ان پر گھنی مڑی ہوئی پلکیں اسکے حسن

میں اضافہ کرتی تھیں۔اسکے ہاتھ مہندی سے بھرے تھے۔کوئی ڈیزائن نہیں تھا یوں لگتا تھا جیسے اس نے اپنے ہاتھ مہندی میں ڈبوئے تھے۔

"نہیں معلوم۔"قدسیہ نے مصروف سا جواب دیا۔

"امی یہ کوئی جن کا بچہ تو نہیں ہے؟"اس نے اپنے تئیں قدسیہ کو بہت خوفناک بات کہی۔قدسیہ جو لوہے سے بنی پائپ نما پھونکنی سے کوئلے کو دہکا رہی تھی اسکی بات پر سر پکڑ کر رہ گئی۔

"تمہاری فضول باتوں کا جواب نہیں ہے میرے پاس۔"قدسیہ نے اگلی روٹی لگاتے ہوئے کہا۔

"سچی امی آپ کو یاد ہے جب یہ ہمارے گھر آیا تھا تو۔۔۔۔"

"امی جی پانی ملے گا۔"وہ جو کچھ کہنے لگی تھی اچھل کر کھڑی ہوئی تھی۔

"اسے کیا ہوا ہے؟"مرتجز جو مرزا کے ساتھ ابھی ابھی کھیت سے لوٹا تھا حیرت سے زیب النساء کو دیکھتے ہوئے بولا۔سرمئی آنکھوں والا مرتجز بلا کا پرکشش تھا۔گہرے بھورے گھنگریالے بال اسکی دودھ دھیار نگت پر چار چاند لگاتے تھے۔وہ ہلکے بھورے رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔

"کہتی ہے تم جن کے بچے ہو۔"قدسیہ نے ہنستے ہوئے کہا تو مرتجز بھی ہنس دیا۔زیب النساء کے گال شرم سے لال ہوئے۔وہ دوبٹہ دانتوں تلے دبائے

نظریں جھکائے کھڑی رہی۔
"زیبی۔" مرتجز نے بسے بلایا تو وہ اسکی طرف مڑی۔
مرتجز زرا سا جھک کر اسکے قریب ہوا۔
"پانی لادو ورنہ جن آجائے گا۔" اس نے اپنی سرمئی آنکھیں پوری کھول کر اسے کہا۔ زیب النساء نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا اور بھاگ کر مٹکے کی جانب بڑھی۔ پیچھے قدسیہ اور مرتجز کا قہقہا بلند ہوا۔
زیب النساء نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔ اور کوزے میں پانی بھر کر اندر بیٹھے باپ کے سامنے رکھ دیا۔
"مرتجز کو بھی دے آؤ۔" مرزا پنکھی جھولتے ہوئے بولا۔
"وہ یہیں آ۔۔۔" ابھی وہ کچھ کہتی کہ مرتجز ایک بار پھر اسکے پیچھے نمودار ہوا۔
"آگیا میں یہیں۔"
زیب النساء بس رو دینے کو تھی۔ مرتجز اسکی حالت دیکھ کر ہنس دیا۔
"پتا نہیں یہ سب کیوں نہیں سمجھتے یہ جن ہے پورا کا پورا ڈر لگتا ہے اس سے مجھے۔" وہ خود سے باتیں کرتی دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گئی۔ باہر اسکی ماں اسے آوازیں دے رہی تھی مگر وہ کان لپیٹے اندر رونے میں مصروف تھی۔
"انسان نہیں ہے یہ جن ہے۔" وہ روتے ہوئے بار بار یہی کہتی۔

***

وہ پورا دن کمرے سے باہر نہیں آئی تھی۔ مرتجز کے سامنے جس سبکی کا سامنا اسے کرنا پڑا تھا وہ اب اسکے سامنے نہیں جا پا رہی تھی۔

"لڑکی باہر نکل آ کھانا کھالے آکر۔" قدسیہ نے ساتھ والے کمرے سے آواز دی۔

"میں بعد میں کھالوں گی امی۔" اس نے بھی وہیں سے بیٹھے جواب دیا۔

دوسرے کمرے میں اسکی ماں اسے کوس رہی تھی۔ وہ نہیں برداشت کرتے بچوں کے یہ فضول کے نخرے مگر وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔ وہ ہاتھ میں رسالہ اٹھائے کوئی افسانہ پڑھنے میں مصروف تھی۔ قریب پڑی لالٹین کی روشنی کافی دور تک پھیلی تھی۔ وہ کھوئی ہوئی سی پڑھ رہی تھی جب وہ دروازے کی چوکھٹ پر نمودار ہوا۔ شرمندگی ڈر سے بڑھ کر تھی کہ زیب النساء ڈری نہیں بس نظریں جھکا کر بیٹھی رہی۔ اسکے ہاتھ میں بھی ایک لالٹین تھی جسکی روشنی میں اسکا چہرا مکمل واضح تھا۔

"کھانا کھالو زیب النساء ورنہ جن آجائے گا۔" وہ ایک مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائے بولا۔ وہ بیچاری کبھی کبھار ہی زد کرتی تھی اور تبھی مرتجز یہ بولتا اور زیب النساء معصوم تھی یا کچھ اور فوراً اسکی بات مان لیتی۔

"ہے تو سہی ہمارے گھر میں اور کہاں سے آئیں گے۔" وہ اسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ یہ اس نے دل پر پتھر رکھ کر بولا تھا مگر حقیقت میں اسکی ٹانگیں اسے بھاگ کر شرافت سے چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے کو کہہ رہی تھیں۔

"زیبی تمہیں واقع جنوں سے ڈر نہیں لگتا؟" وہ اسے گھور کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"نہیں لگتا۔" وہ رسالہ چہرے کے آگے کرتے ہوئے بولی۔ مگر اسکے ہاتھوں کی لرزش مرتجز دیکھ چکا تھا۔ وہ یقیناً ڈر رہی تھی۔

"اگر کوئی جن تمہارے سامنے آگیا تو کیا کرو گی؟" وہ ایک بار پھر بولا۔

"میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں گی کہ تمہارا دوست وہ رہا۔" وہ ایسے ہی چہرے کے آگے رسالہ کیے بولی تو مرتجز کی نہ رکنے والی ہنسی سن کر اسے رونا آیا۔

"واقع کھانا نہیں کھاؤ گی؟ سوچ لو یہ نہ ہو جن آجائے۔" وہ اب بھی اس لکڑی کے دروازے میں کھڑا بول رہا تھا۔

"آنے دو اس جن کو میں بھی دیکھوں کیسا ہے۔" وہ بھی آج خاموش ہونے کے موڈ میں نہیں تھی۔ مرتجز ہستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

پیچھے زیب النساء نے رسالہ چہرے سے ہٹایا۔ قریب پڑے کوزے میں سے غٹا غٹ پانی پیا۔

"جن کہیں کا۔" وہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے غصّے سے بولی۔

***

رات میں سب باہر ہی سوتے تھے مگر آج زیب النساء نے عجیب زد پکڑ رکھی تھی سو وہ اندر کمرے میں سوئی تھی۔

وہ گہری نیند میں سو رہی تھی۔ سرہانے کے قریب اسکا دوبٹہ پڑا تھا۔ اسکی آنکھ کسی ہلکی روشنی سے کھلی تھی۔ وہ پہلے نیند میں ہلکا سا کسمسائی۔ مگر مسلسل روشن کی وجہ سے اس نے آنکھ کھولی۔

یہ کون اس وقت لالٹین لیے دروازے میں کھڑا تھا؟؟

اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں اور جب اسکی آنکھیں کھلی تو کھلی کی کھلی ہی رہ گئیں۔

وہاں کوئی ہاتھ میں لالٹین لیے نہیں کھڑا تھا وہاں کھڑی وہ چیز نا جانے انسان تھی یا روح مکمل چمک رہی تھی۔ اسک روشنی بہت دور تک پھیلی تھی۔ زیب النساء نے جھٹ سے اپنا دوبٹا اٹھا کر سر پر اوڑھا۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے باہر سوتے ماں باپ کو دیکھا۔ اسکی جان حلق میں اٹکی تھی۔ اس نے روتے

ہوئے قرآن کی تلاوت شروع کر دی مگر وہ چیز ہلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھی۔ وہ کچھ پڑھتے پڑھتے کب رونے لگی اسے محسوس نہ ہوا۔

"امی۔۔۔امی۔۔۔"اس نے اونچی آواز میں پکارا۔ یہ بلا بھی دروازے میں کھڑی ہے اب وہ بیچاری باہر بھی نہیں جا سکتی۔

"ابو۔"اس نے اونچی آواز میں پکارا تو باہر کچھ ہلچل ہوئی۔

روشنی اتنی زیادہ تھی کہ وہ ہر چیز کو باخوبی دیکھ سکتی تھی۔اس نے دیکھا کہ مرتجز اپنی چارپائی سے اٹھ کر بیٹھا اور زیبی کی طرف چہرا کر کے مسکرایا۔اسکی مسکراہٹ کوئی عام مسکراہٹ نہیں تھی۔وہ مسلسل نظریں اس پر جمائے مسکرا رہا تھا۔ کمبخت قدسیہ یا مرزا کو کیوں نہیں اٹھاتا۔

"کھانا کھالو زیب النساء ورنہ جن آجائے گا۔"یہ۔۔۔یہ۔۔مرتجز کی آواز نہیں تھی۔پھر؟؟

لاحولا ولا قوت یہ اس دروازے میں کھڑی چیز کی آواز تھی۔

"امی۔۔۔جن۔۔۔"وہ پوری طاقت سے چیخی اور پھر وہ ہوش کھو بیٹھی۔

***

اسکی آنکھ صبح کے وقت کھلی تھی۔کمرہ کھچا کھچ عورتوں اور بچوں سے بھرا تھا۔رنگ برنگی بولیاں۔

"کمزوری کی وجہ سے بے حوش ہو گئی ہو گی۔"
"حکیم نے کیا بتایا؟"
"ارے کسی سے دم کراؤ۔"
وہ اس صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"میری پیاری بچی اٹھ گئی۔" قدسیہ انکی چارپائی پر اسکے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔
"امی۔" وہ انکے گلے لگ کر رونے لگی۔
"کیا ہوا بچے۔" وہ اسکی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولیں۔
"وہاں۔۔۔ جن۔۔ تھا امی قسم سے۔" وہ ان سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔ مگر دروازے پر مرتجز کو کھڑا مسکراتا دیکھ کر وہ اور زور سے رونے لگی۔ ڈر کے مارے اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ مرتجز نے بھی اسے دیکھا تھا یا یہ کہ وہ جن مرتجز ہی تھا۔
"ارے ابھی مولوی صاحب دم کر کے گئے ہیں اب نہیں آئے گا جن۔"
رات میں انہیں محض اسکی ہلکی سی آواز ہی سنائی دی تھی۔ وہ لوگ اس پر کان نہ دھرتے اگر مرتجز انہیں نا جگاتا۔

"ابو۔۔ابو۔۔زیبی بلا رہی ہے۔" مرتجز نے انکا کندھا ہلایا۔وہ جو سمجھ رہے تھے کہیں دور سے آواز آرہی ہے یک دم اٹھ بیٹھے۔وہ ہوش میں نہیں آرہی تھی سو مجبوراً رات کے وقت مرتجز کو حکیم صاحب کے گھر جانا پڑا مگر زیب النساء کسی طور ہوش میں نہ آرہی تھی۔پھر مولوی صاحب کو بلایا اور یوں آدھا محلہ اکھٹا ہو گیا مگر زیبی ہوش میں نہ آئی۔

"وہ واپس آئے گا۔۔۔امی وہاں سچ میں جن تھا۔" وہ ان کے ساتھ چپک کر بولی۔

"نہیں تھا کچھ بچے تم خوامخواہ ڈر رہی ہو۔" وہ اسے خاموش کراتے ہوئے بولی۔

"زیب النساء کھانا کھالو۔" وہ تازہ پراٹھے کے ساتھ چائے اسکے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ کمبخت کے چہرے کی مسکراہٹ ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔اور پھر یہ جملہ۔۔۔

"ہاں بیٹا کھالو رات میں بھی تھوڑا کھایا تھا۔" قدسیہ نے چائے اسکے سامنے رکھتے ہوئے کہا جسے وہ آنسوں صاف کرتے ہوئے خاموشی سے کھاتی رہی۔ آج کے بعد وہ کبھی کھانے کو انکار نہیں کرے گی یہ طے تھا۔

***

اس دن کے بعد سے زیب النسأ نے مرتجز کے معاملے میں اپنی زبان سی لی تھی۔ وہ اسے جو مرضی کہانیاں سناتا وہ بلکل خاموش رہتی۔ ہاں ایک جملہ وہ کبھی نظرانداز نہیں کرتی تھی۔

"زیب النساء یہ کرو ورنہ جن آجائے گا۔" زیبی کو اسکی اس رات والی وہ مسکراہٹ آج بھی سونے نہیں دیتی تھی۔ اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ ہی بدتمیز حقیقت میں کوئی انسان نہیں تھا۔

***

زیب النساء کچھ لڑکیوں کے ساتھ کنوئیں سے پانی بھر کر لانے میں مصروف تھی جب اس نے دیکھا اسکے ماں باپ بیٹھے کچھ کھسر پھسر کر رہے ہیں۔

"کیا بات ہو رہی ہے اماں۔" وہ تھکی ہوئی انکے قریب بیٹھ کر بولی۔ مرتجز ایک حکیم کے ساتھ کام کرتا تھا۔ وہ بہت دور کام کرنے کے لیے جاتا تھا سو رات کو دیر گئے گھر لوٹتا تھا۔

"تیری شادی کی بات کر رہے ہیں۔" قدسیہ نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔ شرم کے مارے زیبی کے گال لال ہوئے۔ اس نے دوبٹہ درست کرتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

"منظور ہے؟؟" وہ اس سے لڑکے کی رضامندی نہیں بس شادی کی رضامندی مانگ رہے تھے۔

"جیسا آپ کو بہتر لگے۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"چلو ٹھیک ہے رات میں مرتجز آتا ہے تو بات کرتے ہیں۔" مرزا نے کہا تو قدسیہ نے سر ہلایا۔ لو بھلا اس بلا سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی اب۔ زیبی نے دل میں سوچا اور اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ ہاں اگلے دن اسے یہ اطلاع ضرور ملی تھی کہ اگلے ہفتے اسکی شادی کی جارہی تھی۔

وہ پورا ہفتہ گھر میں ہی رہی۔ مرتجز کو تو مہینہ ہوا اس نے دیکھا تو کیا سنا بھی نہیں تھا۔ کمبخت زیبی کو نیند جو رات آٹھ بجے ہی آجاتی تھی۔

مہندی سے دو دن پہلے انکے گھر میں محلے کی عورتوں کا راج تھا۔ وہ لوگ گیت گانے اور خوشی منانے میں مصروف تھی۔ زیب النساء ایک کمرے میں بیٹھی تھی اسکے ساتھ کمرے میں بہت سی لڑکیاں تھی۔ مرد صحن میں ایک جانب بیٹھے تھے۔

"صدیقہ بات سنو۔" اس نے قریب بیٹھی ایک لڑکی کو اپنے جانب کھینچتے ہوئے کہا۔

"بولو دلہن جی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"اچھا بتا نا دلہا کیسا ہے؟" وہ اسکے کان کے قریب جھک کر بولی۔
"اوئے ہوئے دیکھا نہیں تم نے؟" وہ اسے چھیڑتے ہوئے شوخ لہجے میں بولی۔
"ارے کہاں مجھے تو معلوم بھی نہیں کون ہے۔" وہ ہلکی آواز میں بولی کہیں کوئی سن نہ لے۔
"ارے چل جھوٹی۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔
"سچ میں مجھے امی سے پوچھتے ہوئے شرم آرہی تھی۔" وہ دوبٹہ کا ایک سرا دانتوں میں دبا کر بولی۔
"ارے توں نے کیا کبھی مرتجز کو نہیں دیکھا؟" صدیقہ قہقہا لگا کر ہنسی۔
"اس جن کو تو دیکھا ہے مگر۔۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔
"کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ مطلب؟" اسکے تو مانو ہوش ہی اڑ گئے تھے۔
"اب اتنی بن مت زیبی۔" صدیقہ اسکے کندھے پر چت لگاتے ہوئے بولی۔
"تم۔۔ تم جھوٹ۔۔۔ بول رہی ہو ناں؟؟" اسکی آنکھوں میں آنسوں تھے۔
"ارے رے خوشی سے آنسوں آگئے پگلی کی آنکھوں میں۔" وہ ہنس کر بولی۔
ہر کوئی جانتا تھا مرتجز کتنی اعلیٰ شخصیت تھا۔ اسکی دلہن بننا تو خوشقسمتی تھی۔

مگر۔۔۔" کھانا کھالو زیبی ورنہ جن آجائے گا۔" اور یہی اسکی بس ہوئی تھی۔
وہ بے حوش ہو کر صدیقہ کی گود میں گری۔ کیا مطلب وہ ساری زندگی اس جن کے ساتھ گزارنے والی تھی؟ بیچاری بلا کی سادہ اور شرم والی نہ ہوتی تو ایک بار پوچھ ہی لیتی اپنے ماں باپ سے۔ مگر اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔

***

شرم وحیا کے پیشِ نظر اس نے ماں باپ کے سامنے انکار نہ کیا۔ مگر دلہن کے روپ میں وہ مرتجز کے ساتھ بیٹھی اپنی ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

"کیا کر رہی ہو بیٹی تم کون سا کسی اور گھر جا رہی ہو۔" قدسیہ اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"زیب النساء چپ ہو جاؤ ورنہ جن آجائے گا۔" وہ مسکراتا ہوا اسے دیکھ کر بولا۔ زیبی نے اسے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا مگر اسکی مسکراہٹ کا اندازہ اسے باخوبی تھا۔

ہک ہا اب جن سے کیا ڈرنا۔ جن سے تو اسکی شادی ہو رہی تھی۔

***

وہ کمرے میں گھنگٹ اوڑھے اس بلکل سادہ سے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اسکے قریب بیٹھ گیا۔

"ڈر تو نہیں لگ رہا؟" اس نے مسکرا کر پوچھا اور وہ جانتا تھا گھنگٹ کے نیچے اسکے گالوں پر آنسوں بہہ رہے ہوں گے۔

"ارے قسم سے میرا یقین کرو میں انسان ہوں کوئی جن نہیں۔" اس نے اسکا گھنگٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ بلکل سادہ سے حلیے میں بس ہونٹوں پر گہری لپ سٹیک لگائے وہ رونے میں مصروف تھی۔ آنکھوں کا کاجل رونے سے پھیل چکا تھا۔

"اچھا چلو جو پوچھنا ہے پوچھ لو آج میں سچی سچی بتاؤں گا۔" اس نے مسکرا کر دوستانہ انداز میں کہا تو زیب النساء نے نظر اٹھا کر اسکو دیکھا۔ مرتجز نے نظروں میں اسے پوچھنے کی اجازت دی۔

"آپ ہمارے گھر کیسے آئے تھے؟" اس نے نہایت ہلکی آواز میں کہا۔ مرتجز اسکی بات سن کر مسکرایا۔ "تم" سے سیدھا "آپ" اچھا بدلاؤ تھا۔

"سچی بتادوں؟" وہ مسکرا کر بولا۔ زیبی اسکی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکی سو اس نے نظریں جھکالیں۔

"جھوٹ مت بولنا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ کہیں جھوٹ بول کر اسے بے حوش نہ کر دے۔

"چلو پھر پانی وانی پی لو پہلے ہی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

***

سات سالہ وہ بچہ ان ہٹے کٹے مردوں کے سامنے دبک کر بیٹھا تھا۔

"مار سالے کو۔" بس یہ وہ آخری الفاظ تھے جو اس نے سنے تھے۔ اس نے اپنی ٹانگیں سینے سے لگا رکھی تھی۔ اس نے ڈر کر چہرہ گھٹنوں میں چھپا دیا۔ ایک اتنی دلخراش چیخ گونجی کہ اسے محسوس ہوا اسکے کان کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ اس نے روتے ہوئے چہرا اٹھایا اور جو منظر اس نے دیکھا وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ سامنے ان تینوں مردوں کے سر دھڑ سے الگ پڑے تھے۔ پورے ڈبے میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ اسکا لباس مکمل خون آلودہ ہو چکا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر ساتھ کھڑے اس شخص کو دیکھا۔

شخص؟؟ نہیں۔ انسان؟؟ نہیں۔ ارے وہ کیا چیز تھی؟؟

مرتجز نے تجسس سے اسے دیکھا۔ وہ کسی چراغ کے جن کی مانند تھا۔ مکمل روشنی میں ڈوبا۔ اسکا دھڑ عام انسانوں جیسا ہی لگتا تھا مگر اسکی ٹانگیں کہاں تھیں؟؟ مرتجز نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ چیز ہوا کی مانند تیرتی ہوئی اسکے

قریب آئی۔ مرتجز اسے دیکھ کر مسکرایا۔ کتنی پیاری چیز تھی۔ وہ معصوم سا بچہ اس پر فدا ہوا تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ مرتجز کے آگے کیا۔ مرتجز نے بغیر جھجکتے اسکا ہاتھ تھاما۔ کون سی جنگ کون سا خون؟؟ اس بچے کو بس وہ خوبصورت سی چیز پسند آئی تھی۔

اسکا ہاتھ تھامتے ہی وہ چیز انسانی روپ دھارنے لگی۔ مرتجز حیرت سے اپنی سرمئی آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔

کچھ دیر بعد ایک انسان اسکے سامنے بیٹھا تھا۔ مکمل سفید لباس پر سفید پگ باندھے وہ مرد مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" اس شخص نے پوچھا تو مرتجز نے ہاں میں سر ہلایا۔ مرتجز نے کبھی کسی شخص کے چہرے پر اتنا نور نہیں دیکھا تھا۔ اور اسکی آواز تو واللہ۔

"میں واپس آؤں گا۔" وہ اسکے سر پر ہاتھ رکھ کر اچانک سے غائب ہو گیا۔

مرتجز نے ان لاشوں کو سرے سے نظر انداز کیا اور اٹھ کر اس شخص کو ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔

اچانک اسے زور کے چکر آئے اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے ہوش تین دن بعد مرزا خلیل کے گھر میں آیا مگر کہیں ناں کہیں وہ جانتا تھا اسے یہاں کون چھوڑ کر گیا تھا۔

***

"آپ۔۔۔آپ۔۔۔پھر۔۔۔سے۔۔ جھوٹ بول رہے ہیں۔"زیبی کھسک کر اس سے تھوڑا دور ہوتے ہوئے بولی۔

"میرا یقین کرو۔۔۔"وہ کچھ کہہ رہا تھا۔

"آپ بس مجھے ڈرانے کے لیے کہہ رہے ہیں ناں؟"وہ اپنی آنکھوں سے آنسوں صاف کرتے ہوئے بولی۔

مرتجز نے گہرا سانس لیا اور اٹھ کر کوزے میں گڑھے سے پانی لا کر اسکے سامنے رکھا۔

"پی لو۔"مرتجز نے کہا تو زیبی نے بلا تاخیر سارا پانی پی لیا۔

"پھر۔۔پھر۔۔آپ اس واقعے کا سن کر روتے کیوں تھے اور کسی کو بتاتے بھی نہیں تھے؟"اس نے پانی پی کر پوچھا۔

"میں واقع ڈرتا تھا۔وہاں بہت خون تھا پھر ان تین لوگوں کی لاشیں۔۔"اس نے جھرجھری لی۔

"اور دوسرے واقع کے بارے میں بتادوں گا وقت آنے پر۔"اس نے مسکرا کر زیبی کے ہاتھ سے کوزہ لیا۔

***

ایک رات جب سب نیند کی وادوں میں تھی وہ بار بار کروٹ بدل رہا تھا۔ نیند اسکی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

"وہ واپس کیوں نہیں آیا؟" اس نے سوچا۔ اس نے ہر خیال کو جھٹک کر سونے کے لیے آنکھیں بند کیں مگر اپنے چہرے پر روشنی محسوس کر کے اس نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں۔ سامنے دیکھ کر اسکے چہرے پر مسکراہٹ ابھری وہی شخص۔۔ارے نہیں نہیں۔۔وہی چیز اسکے سامنے کھڑی تھی۔ مرتجز اپنی چارپائی سے اٹھ بیٹھا ادھر ادھر دیکھا کوئی نہیں جاگ رہا تھا۔ اس نے اپنا روشن ہاتھ مرتجز کے سامنے کیا تو مرتجز نے مسکراتے ہوئے جھٹ سے اسکا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ایک بار پھر انسانی روپ میں اسکے سامنے کھڑا تھا۔

"میرے ساتھ چلو گے؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔ مرتجز نے مسکرا کر ہاں میں سر ہلایا۔ اور پلک جھپکنے سے بھی پہلے منظر بدلا تھا۔ وہ لوگ ایک انتہائی حسین جگہ پر موجود تھے۔ ہر جانب ہرا گھاس تھا جس میں چھوٹے چھوٹے حسین پھول تھے۔ وہ جگہ اتنی وسیع تھی کہ دور دور تک دیکھنے پر بس وہی منظر دکھائی دیتا۔ مکمل سبزے سے ڈھکے پہاڑ۔ نیلا آسمان جس پر روئی کی مانند اڑتے بادل تھے۔ وہ چند لمحے اس خوبصورتی میں کھو گیا۔ وہاں اس جیسے ہی بہت سے اور لوگ بھی تھے۔ ہر کوئی اپنے کام میں مشغول لگتا تھا۔

"آپ کون ہیں؟" مرتجز نے معصومیت سے اس شخص سے پوچھا۔ مرتجز اسکی انگلی تھامے بغیر ڈرے اسکے ساتھ کھڑا تھا۔

"ہم جنات ہیں۔" اس شخص نے کہا۔

"سچ۔" مرتجز نے حیرت سے اپنی گول گول آنکھیں کھول کر کہا۔

"بلکل سچ۔" اس شخص نے ہامی بھری۔

"تمہیں ڈر نہیں لگا؟" اس شخص نے جھک کر اسے اٹھایا۔

"نہیں۔" مرتجز نے جواب دیا۔

"کیوں؟" وہ شخص اسے کہیں لے جاتے ہوئے بولا۔

"آپ بہت پیارے ہیں اس لیے۔" مرتجز نے اسکے چہرے کو چھوتے ہوئے کہا تو وہ شخص مسکرا دیا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" مرتجز نے پوچھا۔

"میرا نام زارون ہے۔" اس شخص نے اسے ایک جگہ بیٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں انعام دوں؟" زارون نے پوچھا۔

"کسکا؟" مرتجز نے پوچھا۔

"تم بہت بہادر ہو اس لیے۔" زارون نے کہا۔

"تمہارا انعام یہ ہے کہ آج سے ہم سب تمہارے دوست ہیں۔" اس کے کہتے ہی وہاں موجود ہر شخص اسکے گرد جمع ہوا۔ وہ سب تقریباً ایک جیسے تھے۔ سفید لباس زیب تن کیے روشن چہروں والے جنات۔

"سچ میں؟" مرتجز نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بلکل سچ۔" زارون نے ہامی بھری۔

"چلو بتاؤ تمہیں کیا چاہیے؟" زارون نے اس سے پوچھا تو وہ چند لمحے سوچتا رہا۔

"مجھے نہیں پتا۔" بہت سوچنے کے بعد اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

"چلو ہم واپس آئیں گے پھر تم بتانا کے تمہیں کیا چاہے ٹھیک؟" زارون نے کہا تو مرتجز کو یہ مشورہ پسند آیا۔ ایک بار پھر منظر تبدیل ہوا اور اب وہ دوبارہ سے اپنے گھر کے صحن میں رکھی چارپائی پر موجود تھا۔ وہ مسکرا کر لیٹ گیا اب اسے سکون کی نیند آنی تھی۔

***

"کیا۔۔ کیا۔۔ مطلب ہوا اس سب کا؟" وہ بہت مشکل سے اپنا ہوش سمبھالے ہوئے تھی۔

"مطلب میں کوئی جن نہیں ہوں انسان ہی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"وہ سب تو بس میرے دوست ہیں۔" اس نے بال کھجاتے ہوئے کہا۔ زیب النساء کی تو زبان ہی تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔

"تمہیں ان سے ملواؤں؟" مرتجز نے ہمیشہ کی طرح اپنی بڑی بڑی سرمئی آنکھیں پوری کھول کر پوچھا۔

زیب النساء نے اپنے لہنگے کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا اور گھٹنے سینے کے ساتھ لگا کر وحشت سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ یہیں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"بلکل۔" مرتجز نے کہا۔

وہ خاموش تھی جب اچانک دروازے سے ایک چمکتی ہوئی روشنی داخل ہوئی بلکل ویسی جیسی مرتجز نے بتایا تھا۔ زارون اسکے قریب آکر رکا۔ زیبی ڈر کے پیچھے ہوئی۔ زارون نے اپنا ہاتھ اسکے سر پر رکھا تو وہ مکمل انسانی روپ میں آ گیا۔

"سدا خوش رہو بیٹی۔" وہی آواز جو اس رات اسے آئی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ کیا ہے۔۔" وہ یہ کہتے ہوئے اپنا ہوش کھو بیٹھی۔

***

اس نے اپنی زبان کسی کے سامنے نہیں کھولی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ اسے عادت ہو گئی تھی۔اسے یقین آگیا کہ مرتجز بلکل سچ کہتا ہے۔

مرتجز اپنے محلے کا سب سے زیادہ سمجھدار مرد جانا جاتا تھا۔ کسی بھی مسلے کے لیے وہ لوگ مرتجز کے پاس آنا شروع ہو گئے تھے۔ مرتجز نے دین کی تبلیغ کرنے کا سوچا۔ وہ ہر ہفتے کی رات کو گاؤں کے مردوں اور لڑکوں کو تبلیغ کرتا تھا۔اسے معلوم تھا وقت کے ساتھ ساتھ اس گاؤں میں کتنی برائیوں نے اپنی جڑیں قائم کیں تھی۔ چھوٹ، غیبت، نفرت، جادو، شرک ہر برائی وقت کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔

اور یہ بات محض وہی جانتا تھا کو وہ انسانوں کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ وہاں موجود دوسری مخلوقات کی تبلیغ بھی کرتا تھا۔اسکے لہجے میں اتنا اثر تھا کہ وہ دوسرے گاؤں میں بھی مشہور ہو گیا۔ دوسرے گاؤں کے لوگ بھی اسے سننے کے لیے آتے تھے۔

وہ ایک ایسی ہی شام مسجد میں جمع تھے۔ وہ ان سب کے سامنے بیٹھا تھا ہر کوئی اسکے بولنے کا منتظر تھا۔

"آج ہم توحید کے بارے میں بات کریں گے۔" اس نے آنکھیں بند کیے بولنا شروع کیا۔

"توحید کیا ہے؟" ایک بچے نے پوچھا۔ اسکی مجلس کی خاص بات یہی تھی وہاں کسی کو بھی بولنے سے منع نہیں کیا جاتا تھا کوئی کتنا ہی سخت سوال کیوں نہ کرے وہاں بیٹھے کسی شخص کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اسے روکے۔

"توحید اس دنیا کا سب سے عزیم سچ ہے کہ اللہ ایک ہے کوئی اسکی برابری نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی اسکا شریک ہے نہ مددگار اور نہ کوئی وصیلہ اسکے برابر ہے۔ ہر عبادت صرف اسی کے لیے ہے۔ جو کچھ بھی مانگا جائے اسی سے مانگا جائے" اس نے پہلی بار نظریں اٹھا کر مجمع کو دیکھا۔ اسکے چہرے پر مسکراہٹ در آئی۔ ان سب کے ساتھ وہاں ایک اور مخلوق تھی جسے بس وہی دیکھ سکتا تھا۔ مگر اضافہ اس اضافی مخلوق پر تھا۔ انکے چہرے پر دھتکار تھی۔ وہ غصّے سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک جانب وہ نیک جنات کھڑے اسے سن کر مسکرا رہے تھے ایک جانب وہ دھتکاری ہوئی مخلوق کھڑی تھی۔

"لیکن آج کل لوگ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے ہیں۔ کبھی بزرگوں کی قبروں پر سجدے کرنا، کبھی پیروں سے مانگنا، کبھی تعویز، کبھی کسی اور کے نام کا وظیفہ۔ یہ سب شرک ہے اور اللہ شرک کبھی معاف نہیں

کرتا۔" اسکی بات سن کر لوگوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ کچھ لوگوں نے اسے سراہا تھا اور کچھ نے نظریں پھیر لیں۔ انہیں حقیقت دکھائی جا رہی تھی اور وہ اس سے منہ موڑ رہے تھے۔
اچانک اسے عجیب قسم کی بو محسوس ہوئی اس نے باخوبی اس مخلوق کو انسانی روپ میں آتے دیکھا تھا۔

"ہاں ہم سب کچھ اللہّ سے مانگنے پر یقین رکھتے ہیں مگر کیا تم نے نہیں دیکھا ہم بزرگوں کی قبروں پر جا کر جو کچھ مانگتے ہیں وہ ہمیں ملتا ہے؟ وہ بھی تو اللہّ کے نیک لوگوں میں سے تھے اللہّ انکی سنتا ہو گا ہمارے لیے تو وہ بس وسیلہ بنتے ہیں۔" اس شیطانی روح نے کہا۔ مرتجز ہلکا سا مسکرایا۔

"آپکا جواب آپ کے سوال میں ہی ہے۔ یقیناً اللہّ اپنے ان نیک بندوں کی سنتا ہو گا تو آپ اللہّ کے نیک بندے کیوں نہیں بنتے کے آپ خود اللہّ سے کچھ مانگ سکیں۔ آپ اپنے اندر کی اس برائی کو ختم کر دیں جو آپ کو وسیلہ ڈھونڈنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ولی اللہّ کا بندہ ہو سکتا ہے معاذ اللہّ خدا نہیں۔ اور میرا رب انسان سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے ہم یہ کیوں سوچتے

ہیں کہ ہم جو چیز خود اس سے مانگیں وہ ہمیں نہیں دے گا؟" مرتجز نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔

"تم دیندار لوگ ہر چیز کو حرام قرار دے دیتے ہو۔ ہمیں اپنے رب تک جانا ہوتا ہے اگر ہم کسی وسیلے کے ذریعے اس تک جائیں تو اس میں کیا برائی ہے؟" اس شخص نے بلند آواز میں کہا کچھ لوگ تھے جو اس سے اکتفاد کر رہے تھے۔

"وسیلہ ہے بلکل ہے۔ نماز ہے قرآن ہے۔ اسکے علاوہ کسی بھی انسان سے مانگنا شرک ہے۔ اللہ قرآن میں کہتا ہے

"وَاِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡن"

"ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔"

"تم ہمیں ہمارے دین میں غلط عقائد لا کر ہم سے اسے چھیننا چاہتے ہو۔" اس شخص نے غصّے سے کہا۔

"میں کسی سے کچھ نہیں چھین رہا میں اپنے رب کا کلام آپ تک پہنچا رہا ہوں۔ میں انہیں راہ دکھاتا ہوں اس پر چلنا نہ چلنا انکی مرضی ہے۔ جو اللہ سے جڑیں انہیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی انکے لیے صرف اللہ کافی ہوتا ہے۔"

وہ شیطانی روح چند لمحے خاموش رہی۔ وہ قائل دکھائی دیتی تھی۔ جب ہر مخلوق اللہ سے مانگ رہی تھی اسے مل رہا تھا تو وہ کیوں بھٹکا ہوا تھا؟ اس نے نظریں جھکالی۔

"بلکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم ہمیں اس کو ختم کرنا چاہیے۔" مجلس میں سے ایک شخص نے کہا تو سب نے ہامی بھری۔ وہ مسکرادیا۔ سب کے جانے کے بعد وہ اسکے پاس آیا۔

"میں بھی اللہ سے جڑنا چاہتا ہوں۔" اس شیطانی روح نے کہا۔

"بلکل تم ایسا کر سکتے ہو۔"

مرتجز نے نرمی سے کہا۔

اس نے مرتجز کی تلقید میں شہادت دی تھی اور وہ وہیں سجدے میں گر پڑا تھا۔ زارون اسے دیکھ کر مسکرایا وہ جانتا تھا مرتجز ایسا کر سکتا ہے۔

***

وہ ہفتے میں ایک دن تبلیغ کرتا تھا دور دور سے لوگ اسے سننے کے لیے آتے تھے۔ اللہ نے اسے ایک بیٹے اور بیٹی سی نوازا تھا۔ زیب النساء عورتوں کو قرآن پڑھاتی تھی۔

اسکی مجلس میں شریک ہوتے بہت سے شیطانی جنات نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

***

وہ فجر کے بعد آج اسکی مجلس میں جمع تھے۔ وہاں لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ ان میں ہندو، مسلمان سب تھے۔ ہاں وہ مخلوق بھی۔

جب سب خاموش ہو گئے تو اس نے بولنا شروع کیا۔

"دنیا۔۔۔"

"یہ دنیا ایک بہت بڑا جھانسا ہے۔ ایک چمک ہے جو دیکھنے میں پیاری لگتی ہے در حقیقت یہ بلکل خالی اور کھوکلی ہے۔ ہم سوچتے ہیں پیسہ، دولت، مقام و مرتبہ یہ سب ہماری ضروریات ہیں مگر اصل دولت تو وہ ہے جو مرنے کے بعد بھی کام آئے۔ کیا تم میں سے کوئی ہے جس نے اپنا مال و دولت ایسے جمع کیا کے وہ اسکے ساتھ قبر میں جائے؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔ مجمع میں خاموشی چھا گئی۔

"ہاں کام آئے گا اگر ہم اسے اللہ کی راہ میں ہی خرچ کریں۔ مگر ہم یہ سوچتے ہی کہاں ہیں۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے آج ہم گھر بناتے ہیں کل ہم مٹی کے نیچے ہوں گے۔ آج محفلیں سجتی ہیں کل ہم حساب کے لیے اکیلے کھڑے

ہوں گے۔ آج ہم ہیرا پھیری کرتے ہیں کل وہی ہمارے نامہ اعمال کی صورت میں ہمارے ہاتھوں میں ہو گا۔ دیکھ پاؤ گے اپنا نامہ اعمال؟" چند لوگوں کی آنکھوں سے آنسوں جاری ہوئے۔

"تم مسلمانوں نے قبر، حساب اور آخرت کے ڈر سے زندگی جینا ہی حرام کر لیا ہے۔" ایک ہندو غصّے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مرتجز چہرا جھکا کر ہنس دیا۔ اسے اس ہندو کے قریب کھڑی وہ شیطانی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔

"زندگی جینا ہر انسان کا حق ہے مگر جینے کا مطلب بھول جانا نہیں ہے۔ دنیا نعمت ہو سکتی ہے آخری منزل نہیں تو لوگ اپنا اصل صرف اس دنیا کو کیوں ماننے لگ جاتے ہیں؟ کیا انہیں صرف سفر سے لطف اندوز ہونا ہے منزل کی پرواہ نہیں؟" وہ نرمی سے بولتا رہا۔ اس خاموشی میں اسکی آواز گونج رہی تھی۔

"تم جیسے لوگوں کو زندگی کا کیا مطلب پتا تم جیسے لوگ ہر خوشی کو خود پر حرام کر کے بیٹھے ہو۔ کیا اللّٰہ نے خوشی نہیں دی؟ کیا تمہارے رب نے زنگی کے مزے حرام کر دیے ہیں؟" وہ شخص تیش سے بولا۔

اللّٰہ نے مزے دیے دیے ہیں مگر حدود بھی مقرر کی ہیں۔ ان حدوں کو توڑنا انسان کی اپنی مرضی ہے۔ انسان ہر مزے کو لذت بنا لیتا ہے، لذت کو عادت

بنالیتا ہے اور ایسے ہی انسان نفس کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔" اس کی بات نے سامنے کھڑے شخص کو سوچ میں مبتلا کر دیا۔

"میری نظر میں اسلام قید ہے۔" اس شخص نے آہستگی سے کہا۔

"اسلام قید نہیں ہے اسلام رہنما ہے۔ زندگی کا سفر اندھیروں سے بھرا پڑا ہے۔ لوگ صرف چمک دیکھتے ہیں اصل نور نہیں۔" اس کے کہتے ہی وہ شخص خاموشی سے بیٹھ گیا۔ قریب کھڑی مخلوق مسکرائی۔

"دیکھتے ہیں کتنے تمہارے پاس آتے ہیں کتنے میرے۔" وہ یہ کہہ کر ہوا میں محو ہو گیا۔ مرتجز نے مسکرا کر مجلس جاری رکھی۔

***

"آپ کو ڈر نہیں لگتا؟" ایک دن مہر نے پوچھا۔

"لگتا ہے بہت لگتا ہے۔" وہ بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے بولا۔ مہر النساء کو حیرت ہوئی۔

"کیوں؟؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

مرتجز نے کنگھا ایک جانب رکھا اور قریب پڑی لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ بوڑھا ہو رہا تھا۔ اسکے بچے جوان ہو چکے تھے۔ مرزا اور قدسیہ اب اس دنیا کا حصہ نہیں رہے تھے۔

"میں نے بائیس سال کی عمر سے تبلیغ شروع کی تھی زیبی۔" اس نے آہستگی سے نظریں جھکا کر کہنا شروع کیا۔

"اب میری عمر پینتالیس سال ہو چکی ہے۔ میں نے تئیس سال تبلیغ کی۔ میں ہر قسم کے شخص سے ملا ہوں۔ گنہگار، بھٹکے ہر قسم کے شخص۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میں نے کسی کو کوئی غلط راستہ نہ دکھا دیا ہو۔" اس کی آواز میں دکھ سمٹ آیا۔

"کہیں بار لوگ ایسے سوال کر دیتے تھے جنکا جواب میرے پاس نہیں ہوتا تھا۔" مرتجز کا بارہ سالہ بیٹا بھی ایک جانب بیٹھا اسے سن رہا تھا۔

"مگر میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا ورنہ وہ لوگ مزید ناامید ہو جاتے مزید بھٹک جاتے۔ اس لیے میں نے ایک مطمئین جواب دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر مجھے یہ خوف سونے نہیں دیتا کہ کہیں میری کسی بات کی وجہ سے کسی شخص نے کوئی غلط راستہ اختیار نہ کر لیا ہو۔ کہیں میری نیکی میرے لیے عزاب نہ بن جائے۔ کہیں میرا رب میری ایک غلطی کی وجہ سے مجھ سے دور نہ ہو جائے۔" وہ دکھ سے کہتا رہا۔

"اللہ آپ کی ہر خطا کا معاف فرمائے مرتجز۔" زیبی نے کہا تو مرتجز نے مسکرا کر آمین کہا۔

***

وہ ایک رات نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آیا۔ اس نے ایک سیاہ دھویں کی مانند اڑھتی چیز کو خود کے سامنے کھڑے پایا۔ وہ ماروق تھا۔ برائی کا سردار۔

مرتجز مسکرا کر اسکے سامنے کھڑا ہو گیا۔

تم کیا سمجھتے ہو کہ تم ایک معمولی سا انسان ہو کر ہمیں ہدایت دے سکتے ہو؟ ہم آگ سے بنے ہیں اور تم گندی مٹی سے۔" ماروق نے غصے سے کہا۔

"اسی مٹی میں اللہ نے روح پھونکی ہے اسے آگ بھی نہیں جلا سکتی۔" مرتجز نے مسکرا کر کہا۔

"ہم نے ہزاروں برائیوں کو پھیلا دیا ہے جھوٹ، شرک، جادو سب تم کیا کر سکتے ہو اب؟" ماروق نے قہقہا لگایا۔

"میں وہی کروں گا جو موسیٰ نے فرعون کے سامنے کیا تھا اللہ کا نام بلند۔"

مرتجز نے سینے سے لگائی کتاب اٹھا کر کہا۔ ماروق اسے دیکھ کڑبدک کر پیچھے ہوا۔

مرتجز اونچی آواز میں سورۃ فلک اور سورۃ الناس کی تلاوت شروع کر دیتا ہے۔

ماروق چیختا ہے۔اللہ کا ذکر اس شیطانی طاقت کو کمزور کر رہا تھا۔
"انسان صرف تب تک کمزور ہوتا ہے جب تک وہ اللہ سے دور ہوتا ہے۔" وہ تلاوت مکمل کر کے بولا۔
ماروق چیختے ہوئے ہوا میں تحلیل ہو گیا۔
مرتجز نے گہرا سانس لیا اور گھر کی جانب بڑھ گیا۔
وہ ہر رات اپنے بچوں کو صحن میں بیٹھا کر ویسے ہی تبلیغ کرتا تھا جیسے وہ اور لوگوں کو کرتا تھا۔اسکے بچے اب بہت بڑے ہو چکے تھے اور وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔
اسکے بڑے بیٹے شاہنواز مرتجز کی شادی گاؤں کی ایک استانی سے کی گئی تھی۔
اس سے چھوٹی بیٹی سکینہ مرتجز کی شادی بھی گاؤں کے ایک حکیم سے ہوئی تھی۔
اور سب سے چھوٹے بیٹے شیراز مرتجز نے پسند کی شادی کی تھی۔
شاہنواز کو اللہ نے دو بیٹوں سے نوازا تھا۔
سکینہ کی ایک بیٹی اور دو جوڑواں بیٹے تھے۔اور شیراز کی ہاں محض ایک بیٹا تھا۔ابراہیم شیراز۔
***

مرتجز اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو اکثر اپنی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ سب اسے بہت اشتیاق سے سنتے تھے۔

مرتجز اچانک بہت بیمار ہو گیا تھا۔ اس نے ایک رات شیراز کو اپنے کمرے میں بلایا۔

"جی ابا جان آپ نے بلایا۔" وہ کمرے میں داخل ہوا۔

"ہاں بیٹھو یہاں۔" مرتجز نے کہا تو وہ قریب پڑی لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابراہیم کو قریب بیٹھی مہرالنساء نے اٹھا رکھا تھا۔ وہ ابھی محض تین ماہ کا تھا۔ شیراز کی بیوی کی طبیعت بہت خراب رہتی تھی جسکی وجہ سے ابراہیم مہرالنساء کے حوالے کیا گیا تھا۔

"تم جانتے ہو شیراز مجھے اللہ نے اپنے بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ میں نے ساری زندگی اپنے رب کا شکر ادا کرتے گزاری ہے۔". وہ چارپائی پر بیٹھا ہلکی آواز میں کہہ رہا تھا۔ اسے بولنے میں مشکل ہو رہی تھی مگر وہ بولتا رہا۔

"اگر میرے والد صاب مرزا خلیل میرے ساتھ نہ ہوتے میں یہ سب حاصل نہیں کر سکتا تھا بچے۔ ان نے میری بہترین تربیت کی۔ میں انکی سگی اولاد نہیں تھا مگر ان نے سگوں سے بڑھ کر مجھے پیار کیا۔" وہ یہ کہہ کر کھانسنے لگا تو شیراز نے انہیں پانی دیا۔

"پتر تم اپنے بچوں کی بہترین تربیت کرنا۔ انہیں بہت آگے لے کر جانا۔ اور میری بات یاد رکھنا شیراز جب تک سمجھ بوجھ کی عمر کو نہ پہنچ جائے تم خاموش رہنا۔" مرتجز نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں ابا آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" شیراز نے کشمکش سے پوچھا۔

"تمہارا بیٹا خاص ہے۔ وہ بہت آگے جائے گا۔ میرے تمام بچے بہت آگے جائیں گے میں جانتا ہوں مگر ابراہیم خاص ہے۔ تم یہ بات کسی کو مت بتانا۔ شاید وہ لوگ اسے تنگ کریں اسے ستائیں مگر تم اسکی بہترین تربیت کرنا اسے سکھانا، اسے بتانا کے اسکے دادا نے کیسے زندگی بسر کی تھی۔" انہوں نے کہہ کر مہر سے ابراہیم کو لیا اور شیراز کے حوالے کیا۔

"تم سمجھ جاؤ گے۔" وہ بس اتنا کہہ کر لیٹ گیا۔ شیراز کشمکش سے اسے لیا اپنے کمرے میں آ گیا۔

***

دو دن بعد طبیعت کی خرابی کی وجہ سے مرتجز زندگی سے ہار گیا۔ اسکی معیت صحن میں پڑی تھی۔ دور دور سے لوگ اسکے جنازے میں شریک ہو رہے تھے۔

"سنیں ناں یہ چپ ہی نہیں کر رہا اسے کیسے سمبھالوں۔" شیراز کی بیوی نے

ابراہیم کو چپ کراتے ہوئے کہا۔
"یہ کیا پہنار کھا ہے تم نے اسے؟" شیراز نے اسکی قمیض کا گلا درست کرتے ہوئے کہا۔
"جاؤ کچھ اور پہناؤ اسے۔" شیراز نے کہا تو اسکی بیوی نے اسکے کندھے سے ہوتے گردن پر موجود نشان کو ڈھکنے کی کوشش کی۔
"اف ہوا چھا۔" شیراز کی بیوی اسے کپڑے پہنانے لے گئی۔ اسکی قمیض اتارنے پر وہ نشان واضح ہوا تھا۔ وہ ایک پھولوں کی بیل جیسا نشان تھا۔ بہت ہلکا اور باریک سایوں کہ بہت دھیان سے دیکھنے پر نظر آتا۔ وہ جسمانی رنگت جیسا ہی تھا اس لیے بہت زیادہ واضح نہ تھا۔

***

دو دن پہلے۔

"تمہارا بیٹا خاص ہے۔" مرتجز اس سے کہہ رہا تھا۔
"تم سمجھ جاؤ گے۔"
زیب النساء کی گود میں لیٹا ابراہیم مسلسل ہنس رہا تھا۔ ہوں کے وہ کسی کو دیکھ سکتا ہو۔

زارون۔۔۔

وہ اسکے سامنے کھڑا اسکے ساتھ کھیل رہا تھا اور ابراہیم اسکی حرکتوں پر مسکرا رہا تھا۔

مرتجز کو چند دن پہلے احساس ہوا تھا کہ اس گھر میں مرتجز کے علاوہ ابراہیم بھی وہ سب دیکھ سکتا تھا جو اور کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

مگر شیراز کو یہ بات راز رکھنی تھی اور رکھوانی تھی تب تک جب تک ابراہیم خود اس بات کو اچھے سے سمجھ نہ جاتا۔

مگر یہ طے تھا ابراہیم ان سب بچوں میں سب سے زیادہ خاص تھا۔

***

ختم شدہ۔

یہ ایک مکمل افسانوی کہانی ہے اسے حقیقت سے مت جوڑا جائے۔